A Comparative Study of the Concept of Theology in Ghalib and Iqbal's Thought

غالب اور اقبال کے تصور الہیات کا تقابلی جائزہ

KhadijaNasreen*[1]
Ph.DScholar,Department of Urdu,MY University, Islamabad
Dr.Muhammad Zahid Umar*[2]
Assistrant Professor(Adjunct), Department of Urdu, MY University, Islamabad

خدیجہ نسرین☆[1]
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد زاہد عمر☆[2]
اسسٹنٹ پروفیسر (ایڈجنکٹ)، شعبہ اُردو،، مسلم یوتھ یونیورسٹی، اسلام آباد

Correspondance:mahillalubab@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 15-04-2026
Accepted:28-06-2026
Online:28-06-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: A comparative study of the theological conceptions of Mirza Asadullah Khan Ghalib and Allama Muhammad Iqbal, two major figures of Urdu literature who, despite belonging to different historical periods, both centred their thought on the relationship between the human being, the universe, and God. Ghalib, writing in the age of Mughal decline, presents a theology shaped by Wahdat-ul-Wujud, Sufi absorption, rational scepticism, and playful irreverence; his God is a transcendent, all-encompassing Reality before whom human existence appears illusory or burdensome, and whom he addresses boldly as a beloved and rival. Iqbal, emerging in the era of Islamic revival, builds his theology on the philosophy of Khudi and a dynamic reinterpretation of divine-human relations; his God is a living, creative Absolute who invites the human being to strengthen the self and become an active partner in the ongoing work of creation. The comparison reveals that Ghalib's theology remains a complex intellectual puzzle of wonder and existential questioning, while Iqbal's theology

is an affirmative force of action, selfhood, and cosmic agency, each poet thereby redefining the bond between God-consciousness and self-consciousness in the idiom of his age.

KEYWORDS: Ghalib, Iqbal, Theological Conception, Comparative Theology, wahdat-ul-Wajood, Selfhood, Divine Human Relationship, Sufism.

اردو ادب میں مرزا اسد اللہ خان غالب اور علامہ محمد اقبال دو ایسے تابناک ستارے ہیں جنہوں نے اپنے فکر و فن سے فکر انسانی کی راہیں روشن کی ہیں۔ اگرچہ دونوں شعرا مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے سیاسی، سماجی اور فکری حالات ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے لیکن دونوں کا بنیادی موضوع فکر انسان، کائنات اور خدا کا باہمی تعلق یعنی تصورِ الٰہیات ہے۔ غالب اٹھارویں اور انیسویں صدی کی مغلیہ سلطنت کے زوال اور جدید مغرب کے تسلط کے عہد کی پیداوار تھے جبکہ اقبال انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں اسلامی دنیا کی بیداری اور حریت کی تحریکوں کے علمبردار تھے۔ غالب کے ہاں تصور الٰہیات میں تشکیک، وحدت الوجود کی روایتی صوفیانہ فکر، شوخی اور ایک عقلی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس اقبال کے ہاں الٰہیات کا تصور خودی پر مبنی اور وجودی ہنگامہ آرائی سے عبارت ہے۔ دونوں شعرا کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا خدا ایک ایسا وراء الورا اور محیط کل وجود ہے جس کے سامنے انسان کا وجود محو یا بکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے جبکہ اقبال کا خدا ایک ایسی مطلق حقیقت ہے جو انسان کو اپنی "خودی" کی تسخیر اور خدا کی نیابت کا درس دیتا ہے۔

غالب کے ہاں تصور الٰہیات کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ وحدت الوجود کا وہ صوفیانہ عقیدہ ہے جو کلاسیکی فارسی اور اردو شاعری کا اہم جزو رہا ہے۔ غالب خود کو موحد اور وحدت الوجود کا قائل کہتے ہیں لیکن ان کا یہ عقیدہ محض روایتی تصوف بھی ہے اور اس میں عقلی اور تشکیک کی آمیزش بھی ہے۔ غالب کا ماننا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے وہ دراصل خدا ہی کے وجود کا عکس یا جلوہ ہے اور انسان کا اپنا وجود محض ایک فریب یا وہم ہے۔ اس پس منظر میں غالب کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں (۱)

غالب کائنات کی تمام کثرت کو ایک ہی حقیقت واحدہ کے مظاہر سمجھتے ہیں۔ غالب کے اس رویے میں جہاں ایک طرف صوفیانہ محویت ہے تو دوسری طرف خدا کی ذات اور اس کی کائنات کے تعلق پر شدید استفہام بھی ہے۔ وہ وجود حقیقی اور وجودِ مجازی کے درمیان کے فرق کو اس انداز میں مٹاتے ہیں کہ خدا کا وجود ہی واحد حقیقت قرار پاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کی بے بسی اور خدا کی بے نیازی پر طنز بھی کرتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر ان کے وحدت الوجود کے تصورِ الٰہیات کی روشن مثال ہے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں! (۲)

اس شعر میں غالب نے فلسفہ وحدت الوجود کے اس بنیادی نقطے کو موضوع بنایا ہے کہ جب دیکھنے والا (شاہد)، دیکھی جانے والی چیز (مشہود) اور دیکھنے کا عمل (شہود) سب ایک ہی ذات باری تعالیٰ کا حصہ ہیں تو پھر یہ دنیا کا تماشا اور کثرت کا مشاہدہ کیوں اور کس لیے ہے؟ یہاں غالب کا انداز فکر صوفیانہ ہوتے ہوئے بھی استفہامیہ اور تحیر سے بھرا ہوا ہے ۔

غالب کی الٰہیات کا دوسرا اہم پہلو ان کی خدا کے ساتھ شوخی، گستاخی اور معشوقانہ بیباکی ہے۔ غالب خدا کو ایک انتہائی بے نیاز، جابر اور صاحب اقتدار وجود کے طور پر بھی دیکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس کے سامنے جھکنے کے بجائے استفہامیہ تخلیق کے طور پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا اور انسان کا تعلق صرف عبد اور معبود کا روایتی تعلق نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کا ناز، لاڈ اور گلا شکوہ شامل ہے۔ غالب خدا اور انسان کے اس تعلق میں حاکم اور محکوم کے تعلق کو موضوع نہیں بناتے بلکہ ان کی نظر میں عشق کی معراج یہ ہے کہ عاشق پابندیوں سے آزاد ہے۔ گویا غالب کے ہاں تصور الٰہیات میں بھی روشن خیالی موجود ہے۔ اس حوالے سے سید مشکور حسین یاد لکھتے ہیں:

"غالب کے ذوق الٰہیات نے سب سے بڑا کام یہی کیا ہے کہ ہمیں غالب کے اشعار میں آزاد خیالی اور روشن ضمیری کی نئی سے نئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔"(۳)

غالب خدا کے جلال اور اس کی بے نیازی سے ڈرنے کے بجائے اس کے سامنے اپنے دکھوں، اپنی ناکامیوں اور کائنات کی ناقص ساخت کی شکایت رکھتے ہیں۔ غالب کا خدا ان سے دور آسمانوں پر بیٹھا وہ قاضی نہیں جو صرف سزا و جزا دیتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا حریف اور معشوق ہے جس سے انسان ہر بات پر بحث کر سکتا ہے۔ غالب کے اس رویے کو ان کے اس مشہور شعر میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے (۴)

غالب کا تصور الٰہیات روایتی مذہبی خوف سے آزاد نظر ہے۔ وہ خدا سے رحم کی بھیک مانگنے کے بجائے اپنے ان ارمانوں اور گناہوں کا حساب مانگتے ہیں جو وہ زندگی میں وسائل یا توفیق نہ ہونے کی وجہ سے نہ کر سکے۔ یہ شوخی اور بیباکی

غالب کی الہیات کو ایک انسان دوست اور وجودی رنگ دیتی ہے جہاں انسان اپنی کمزوریوں کے باوجود خدا کے سامنے اپنا مقدمہ پوری جرات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

غالب کے برعکس علامہ اقبال کے تصورِ الہیات کی بنیاد فلسفہ خودی اور وحدت الشہود کی جدید تعبیر پر استوار ہے۔ اقبال غالب کے عہد کے بہت بعد آئے اور انہوں نے مغرب کے سائنسی، عقلی اور فلسفیانہ افکار کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر کا گہرا مطالعہ کیا۔ اقبال کا خدا ایک مطلق اور جامد وجود نہیں جو کائنات کو بنا کر بے نیاز ہو گیا ہو اور نہ ہی وہ ایسا وجود ہے جس میں انسان حلول کر کے اپنی ہستی کو مٹا دے۔ اقبال کے نزدیک خدا "ذات مطلق" ہے اور انسان ایک خودی کی عملی صورت ہے۔ اقبال کی الہیات کا بنیادی مقصد انسان اور خدا کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم کرنا ہے جس میں انسان خدا کی ذات میں فنا ہونے کے بجائے اپنی خودی کو اس حد تک استوار کرے کہ وہ خدا کا خلیفہ اور کائنات کا معنوی و حقیقی عامل بن جائے۔ اقبال خدا سے اس تعلق کو مضبوط کرنے لیے لیے قرآن کو تھامنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعدد اشعار کا مآخذ قرآن ہے۔ اقبال اور قرآن کے اس رشتے کے پس منظر میں سید آصف جاہ جعفری رقمطراز ہیں:

> "اقبال کامل یقین رکھنے والے مسلمان تھے جنھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے فکری آہنگ کی تکمیل کی۔ ذہنی تنظیم کا قرآن و سنت کی روشنی میں یکجا اور متفق ہونے ہی سے اقبال کی فکر کو نمو میسر آئی۔"(۵)

اقبال نے اپنے اس تصورِ الہیات کو غالب کے صوفیانہ نفی خودی کے رد عمل میں پیش کیا۔ اقبال کا ماننا ہے کہ کائنات اور خدا کا تعلق ایک تخلیقی عمل کا نام ہے۔ خدا ہر لمحہ تخلیق کے عمل میں مصروف ہے اور انسان اس تخلیقی عمل میں خدا کا شریک کار ہے۔ اقبال کے ہاں خدا ایک ایسا حیّ و قیوم وجود ہے جو انسان کی تگ و دو، اس کے عمل اور اس کی ارتقائی جدوجہد سے محبت کرتا ہے۔ اقبال کا خدا انسان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی ہستی کو قطرے کی طرح سمندر میں ملا کر ختم کر دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ قطرہ خود کو گہر بنا لے۔ اقبال کا یہ مشہور شعر ان کے اس متحرک اور انسان مرکز تصور الہیات کا عکاس ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (۶)

اس شعر میں اقبال نے الہیات کے روایتی تصورِ تقدیر کو بالکل الٹ دیا ہے۔ ان کے ہاں خدا اور بندے کا تعلق محکومی اور حاکمیت سے نکل کر ایک باہم احترام اور تخلیقی شراکت داری کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ انسان جب اپنی خودی کو پختہ کر لیتا ہے تو خدا اس کی ارادہ و رضا کو کائنات کی تقدیر بنانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ تصور غالب کے اس انسان سے بہت مختلف ہے جو بے بسی اور لاچاری کے عالم میں کائنات کے تماشے کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اگر غالب اور اقبال

کے تصورِ الہیات میں کائنات اور ذات باری کے تعلق کا موازنہ کیا جائے تو غالب کے ہاں کائنات کی حقیقت پر ایک استفہامیہ نشان ہے۔ غالب کا یہ الوہی استفہام ان کے اس شعر سے بخوبی عیاں ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے (۷)

غالب کبھی کائنات کو خدا کا جلوہ کہتے ہیں اور کبھی اسے ایک موہوم اور بے معنی سایہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں خدا کا وجود اتنا محیط ہے کہ کائنات اور انسان کا وجود اس کے سامنے ہیچ ہو جاتا ہے۔ غالب اپنے ایک اور شعر میں فرماتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (۸)

اس شعر میں غالب نے وجود اور عدم کے فلسفے کو درد مندی اور طنز کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کا اپنا وجود اس کے لیے ایک بارِ گراں اور مصیبت بن گیا ہے۔ اگر انسان کا اپنا وجود نہ ہوتا تو وہ خدا کی مطلق ذات کا حصہ ہوتا۔ یہاں الہیات کا تصور انسان کی ذاتی ہستی کو نفی کرنے اور خدا کی ہمہ ہست کو تسلیم کرنے کی طرف جاتا ہے۔ غالب کا خدا انسان کی عدم موجودگی میں بھی مکمل تھا اور انسان کا ہونا دراصل اس کی اپنی پریشانی کا باعث بنا۔ غالب اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان کو پابند بنایا گیا ہے۔ اسے اگرچہ اختیار کی طلب ہے، اپنی پابندی پر اعتراض ہے لیکن اس پابندی سے فرار کی کوئی صورت دستیاب نہیں۔ بقول سید مشکور حسین یاد:

"غالب دراصل اللہ کی نافرمانی کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہ کون سا ایمان کون سی وفاداری ہوئی کہ ایک طرف تو آپ اللہ کو مان رہے ہیں دوسری طرف اس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔۔۔۔ اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نافرمانی بعید از قیاس ہے۔"(۹)

اس کے برعکس اقبال غالب کے اس نقطہ نظر سے سخت اختلاف کرتے ہیں۔ اقبال کے ہاں انسان کا وجود خدا کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا خدا کا وجود انسان کے لیے۔ اقبال کی الہیات میں خدا اور انسان ایک دوسرے کے بغیر ادھورے معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال انسان کے وجود کو خدا کی تخلیقی قوت کا شاہکار مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر انسان نہ ہوتا تو خدا کے حسن اور اس کی ربوبیت کا اظہار کیسے ہوتا؟ اقبال نے اپنی نظموں اور غزلوں میں اس خیال کو بارہا دوہرایا ہے کہ خدا اور انسان کا تعلق ایک باہمی سوز و ساز کا تعلق ہے۔ اقبال کا یہ شعر اس تقابلی فکر کو خوبصورتی سے واضح کرتا ہے:

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر (۱۰)

اقبال کا انسان خدا سے مخاطب ہو کر نہ صرف اپنے زمین پر بھیجے جانے کے فیصلہ پر سوال اٹھاتا ہے بلکہ خدا کو یہ باور کراتا ہے کہ اب جبکہ مجھے اس کائنات کی آبادکاری اور تسخیر کے کام میں لگا دیا گیا ہے تو اب تم میرے کام کا نظارہ کرو اور میرا انتظار کرو۔ اقبال کا یہ تصور غالب کی بے بسی کے مقابلے میں انسان کی خود اعتمادی اور خدا کے ساتھ ایک فعال تعامل کا اظہار ہے۔ اقبال کی الہیات میں خدا انسان کے اس جاہ و جلال اور کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے نہ کہ اس کی عاجزی اور خودی کی نفی پر۔

غالب کے تصورِ الہیات میں گناہ، ثواب، جنت اور دوزخ کا تصور بھی روایتی مذہبی فکر سے ہٹ کر ایک خاص فلسفیانہ اور شوخ انداز رکھتا ہے۔ غالب کے نزدیک جنت اور دوزخ محض دل کے بہلاوے کے ذرائع ہیں یا پھر خدا کی بے نیازی کے مظاہر۔ وہ جنت کی نعمتوں کو عقلی اور حسی سطح پر بہت حقیر سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ خدا کی ذات اتنی بلند ہے کہ وہ انسان کو ان معمولی نعمتوں کی طمع دے کر اپنی عبادت نہیں کروانا چاہتی۔ غالب کے ہاں خدا کی محبت کسی لالچ یا خوف کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر اس فکر کی ترجمانی کرتا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے (۱۱)

غالب کی الہیات میں طاعت و عبادت کا مقصد خدا کی ذات کو خوش کرنا نہیں بلکہ اپنے وجود کی منطق کو تلاش کرنا ہے۔ وہ خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف بھی اس انداز میں کرتے ہیں کہ اس میں خدا کی رحمت کی وسعت پر ایک عجیب طرح کا مان ہوتا ہے۔ وہ خدا کے غضب سے ڈرنے کے بجائے اس کی بخشش کے بے پایاں سمندر پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بھروسے میں بھی ایک فلسفیانہ تحیر اور طنز کی آمیزش موجود ہے۔ غالب کا ذہن سوالات کو جنم دیتا ہے وہ انسان اور خدا کے رشتے کے روایتی تصور سے بے چین ہے۔ اس سے نزدیک ہر وہ تصور سوالات کی زد میں آتا ہے جو انسان کو جامد قرار دینے کی کوشش کرے۔ غالب کی اس فکر کی نشاندہی کرتے ہوئے اے آئی رحمن لکھتے ہیں:

"جب بھی غالب اپنے ہونے سے پہلے کی حالت کا ذکر کرتا ہے یا شاہد و مشہود کا رشتہ واضح کرتا ہے تو وہ کائنات میں اپنے تخلیقی کردار پر گرہ لگاتا ہے۔ یعنی انسان صرف کائناتی قوتوں کا شکار نہیں ہے بلکہ ان قوتوں پر اقتدار حاصل کر کے کائنات کا نقشہ بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔"(۱۲)

دوسری طرف اقبال کے ہاں گناہ، ثواب اور جزا و سزا کا تصور انسان کی ارتقائی سفر اور خودی کی تربیت سے جڑا ہوا ہے۔ اقبال کے نزدیک گناہ وہ عمل ہے جو انسان کی خودی کو کمزور کرے اور ثواب وہ عمل ہے جو خودی کو استحکام بخشے۔ اقبال کی الٰہیات میں دوزخ کوئی آگ کا گڑھا نہیں ہے اور نہ ہی جنت کوئی مادی عیش و عشرت کی جگہ ہے بلکہ دوزخ خودی کی ناکامی اور جمود کا نام ہے۔ جبکہ جنت خودی کی فتح اور مسلسل ارتقا کی حالت ہے۔ اقبال کا خدا انسان کو ایک مجرم کی نظر سے نہیں دیکھتا جو مسلسل گناہ کر رہا ہے بلکہ ایک ایسے مسافر کی نظر سے دیکھتا ہے جو ارتقا کی راہ میں ٹھوکریں کھا کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اقبال کے ہاں خدائی کی پہچان انسان کے عمل سے مشروط ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا ، خدا کا ترجماں ہو جا (۱۳)

اقبال کا تصور الٰہیات انسان کو اپنے افعال کا خود ذمہ دار قرار دیتا ہے اور خدا کو ایک ایسے عادل اور رحیم ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے جو انسان کو اپنی صلاحیتیں بیدار کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کی اطاعت کا مطلب اس کے قوانین فطرت کی تسخیر اور ان پر عمل پیرا ہونا ہے جبکہ غالب کے ہاں اطاعت ایک روایتی بوجھ یا صوفیانہ حیرت کا موضوع ہے۔ اقبال کائنات کی تشکیل کے ان مراحل میں من و تو کی کشمکش اور انسان اور خدا کے دوطرفہ تعلق کو موضوع بناتے ہیں۔ اس پس منظر میں فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "اقبال نے حیات و کائنات، ارتقائے انسانی اور فطرت خداوندی سے متعلق اپنے انقلابی تصورات کو من و تو کی کشمکش شوق کا پیرائیہ بخش کر ان میں روایتی معاملات غزل کی سی دلکشی پیدا کرتی ہے۔ اقبال کے اضطراط مسلسل کی بدولت من و تو کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔ 'تو' کہیں انسان ہے، کہیں کائنات اور کہیں خدا۔ 'میں' سے کبھی اقبال کی اپنی ذات مراد ہے اور کبھی انسان۔ (۱۴)"

غالب اور اقبال کے تصورِ الٰہیات کا ایک اور اہم فرق ان کی زباں و بیان اور علامت نگاری میں بھی ملتا ہے۔ غالب خدا کے لیے حریف، معشوق، صانع اور وجودِ مطلق کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں فارسی کا گہرا اثر ہے اور ان کے استعارے پیچیدہ اور اکثر اوقات ایہام سے بھرپور ہوتے ہیں۔ غالب جب خدا کی بات کرتے ہیں تو ان کے اشعار میں ایک عجیب قسم کی اداسی، تنہائی اور تحیر کی فضائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ خدا کو پکارتے ہیں لیکن ایک ایسے خلا میں جہاں سے جواب کی امید کم ہی ہوتی ہے جس سے ان کی وجودی تنہائی کا تاثر جنم لیتا ہے۔ غالب کے بقول:

کعبے میں جارہاہوں تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشتکو
طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو (۱۵)

اسی طرح اقبال کے ہاں خدا کے لیے "حق"، "ذاتِ مطلق"، "خالق" اور "محبوبِ حقیقی" جیسے مفاہیم استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کا لہجہ رجائیت، توانائی، اور یقین سے بھرپور ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں الہیات کا بیان مایوسی یا تنہائی کا باعث نہیں بنتا بلکہ وہ انسان کے اندر ایک نیا نعرہ حیات اجاگر کرتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں خدا کا تصور انسان کو تنہا نہیں کرتا بلکہ اسے کائنات کے تمام عناصر کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اقبال کا خدا انسان سے گفتگو کرتا ہے، اسے مشورے دیتا ہے اور اس کے سوالات کے جوابات دیتا ہے۔ جیسا کہ ان کی شاہکار نظموں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" میں نظر آتا ہے۔ "شکوہ" میں اقبال انسان کو غالب کی طرح خدا کے سامنے کھڑا کر کے سوالات اٹھانے کی جرات دیتے ہیں جہاں انسان خدا سے اس کی بے وفائی اور اپنے مصائب کا گلا کرتا ہے:

طعن اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے (۱۶)

غالب کائنات کے ہنگامے پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے خدا سے مخاطب ہوتے ہیں اور وحدت الوجود کے دائرے میں رہتے ہوئے کثرت کے وجود پر سوال اٹھاتے ہیں۔ حسن مطلق کو خدا قرار دیتے ہوئے وہ تخلیق کا مقصد خدا کی خود بینی بتاتے ہیں یعنی خدا نے کائنات اس لیے بنائی کہ وہ خود کو اس آئینے میں دیکھ سکے۔ یہ خیال تصوف کی اس روایت سے ملتا ہے جہاں تخلیق خدا کی محبت اور خود شناسی کا نتیجہ ہے۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین (۱۷)

خدا کی یکتائی کو مزید واضح کرتے ہوئے وہ ہر شے میں اس کے جلوے کا ذکر کرتے ہیں مگر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کوئی شے خدا جیسی نہیں۔ دوئی کی نفی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا۔ غالب کی شاعری کا یہ خاصا ہے کہ وہ اگر مسلسل خدا کے سامنے سوالات کا ڈھیر لگاتے ہیں لیکن انھیں اس بات پہ کامل یقین ہے کہ خدا کی ذات واحد و یکتا اور بااختیار ہے۔ وہ انسان کو دیکھ رہا ہے اور انسان کے تمام اعمال کا حقیقی نگہبان ہے۔ اس دنیا میں تمام تر الوہی اختیارات صرف اسی کے پاس ہیں۔

ہر چند ہر ایک شے میں گو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے (۱۸)

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا (۱۹)
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

قطرے اور سمندر کے استعارے سے وحدت واضح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ہر قطرہ سمندر کا ساز ہے اور تنہائی میں خدا کی موجودگی کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔ یہ استعارہ صوفیانہ روایات سے لیا گیا ہے جہاں فرد کو سمندر کا قطرہ سمجھا جاتا ہے جو آخر کار سمندر میں ضم ہو جاتا ہے۔ غالب نے اس استعارے کو اپنے الم اور تنہائی کے تجربے سے جوڑ کر پیش کیا جو ان کی شاعری کو گہرا بناتا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا (۲۰)

اقبال کا تصور الہیات غالب سے مختلف ہے۔ وہ خالق او مخلوق کے روایتی تصور کو اپناتے ہوئے اس میں انسان کے اختیارات کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ انسان کی ہستی ہو دنیاوی فنا سے بلند قرار دیتے ہیں۔ اقبال اگرچہ کائنات کی ناتمامی پر زور دیتے ہوئے خدا کی مسلسل تخلیق کو پیش کرتے ہیں جو برگساں کے creative evolution سے متاثر ہے مگر قرآن کی بنیاد پر قائم ہے۔ امت کی وحدت کو توحید سے وابستہ کرتے ہوئے وہ خود شناسی کو خدا شناسی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تکمیل ہی خدا کی معرفت کا راستہ ہے اور فنا نہیں بلکہ بقا اور بلندی مقصود ہے۔ یہ تصور غالب کے فنا کے رجحان سے بالکل الٹ ہے۔ اقبال کے بقول:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دم دم صدائے کن فیکون (۲۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مرزا غالب اور علامہ اقبال دونوں کے تصورِ الہیات اردو ادب کے عظیم فکری اثاثے ہیں۔ غالب کا تصورِ الہیات انیسویں صدی کے ایک ایسے تفکر کا عکاس ہے جو قدیم صوفیانہ روایات اور جدید عقلی تشکیک کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ غالب نے خدا کو اپنے طرزِ فکر، شوخی اور تحیر سے ایک نیا انسانی رنگ دیا۔ جہاں انسان اپنی تمام تر بے بسی کے باوجود خدا کے سامنے اپنا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف اقبال نے بیسویں صدی

کے جدید تناظر میں الہیات کو ایک انقلابی اور ارتقائی نظریے میں بدل دیا۔ اقبال کا خدا انسان کو بے بس نہیں بناتا بلکہ اسے کائنات کی حاکمیت کا درس دیتا ہے اور اس کی خودی کو خدا کی ذات کا مظہر بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ غالب کے ہاں اگر الہیات ایک حسین اور پیچیدہ فکری معمے اور تحیر کا نام ہے تو اقبال کے ہاں الہیات ایک عمل، قوت اور کائنات کو تسخیر کرنے کے لیے ایک لاپایاں جذبے کا نام ہے۔ دونوں شعرا نے اپنے اپنے عہد کے مطابق خدا اور انسان کے رشتے کو نئی جہتیں دیں اور اردو شاعری کو فکری بالیدگی کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا جہاں خدا شناسی اور خود شناسی ایک دوسرے کے آئینے قرار پاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب، کلاسک، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۰

۲۔ ایضاً، ص ۹۷

۳۔ مشکور حسین یاد، سید، غالب کا ذوق الہیات، نثار آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۱

۴۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب، کلاسک، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۱۸

۵۔ آصف جاہ جعفری، سید، مفکر پاکستان علامہ اقبال، سوہنی دھرتی پبلشرز، ملتان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۰

۶۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۸۴

۷۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب، کلاسک، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۸

۸۔ ایضاً، ص ۳۵

۹۔ مشکور حسین یاد، سید، غالب کا ذوق الہیات، نثار آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۶

۱۰۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۷

۱۱۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب، کلاسک، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۱

۱۲۔ اے آئی رحمن، غالب، مشمولہ، اسد اللہ غالب؛ کائنات میں انسان کا مقام، از، مبشر حسن، لائن پریس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص xxiii

۱۳۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۴

۱۴۔ فتح محمد ملک، آتش رفتہ کا سراغ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲۱

۱۵۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب، کلاسک، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۸

۱۶۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۵

۱۷۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب جدید، مرتبہ، مفتی محمد انوار الحق، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، ۱۹۸۲ء، ص ۴۴۷

۱۸۔ اسد اللہ غالب، مرزا، دیوان غالب، کلاسک، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۶

۲۱۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۶۴

References:

1. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, Classic, Lahore, 2001, p. 100.
2. Ibid., p. 97.
3. Mashkoor Hussain Yaad, Syed, Ghalib Ka Zouq-e-Ilahiyat, Nisar Art Press, Lahore, 1997, p. 11.
4. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, Classic, Lahore, 2001, p. 218.
5. Asif Jah Jafri, Syed, Mufakkir-e-Pakistan Allama Iqbal, Sohni Dharti Publishers, Multan, 2007, p. 110.
6. Muhammad Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, 2006, p. 384.
7. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, Classic, Lahore, 2001, p. 158.
8. Ibid., p. 35.
9. Mashkoor Hussain Yaad, Syed, Ghalib Ka Zouq-e-Ilahiyat, Nisar Art Press, Lahore, 1997, p. 56.
10. Muhammad Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, 2006, p. 347.
11. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, Classic, Lahore, 2001, p. 171.
12. A. I. Rahman, "Ghalib," mashmoola Asadullah Ghalib: Kainat Mein Insan Ka Maqam, az Mubashir Hasan, Line Press, Lahore, 2005, p. xxiii.
13. Muhammad Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, 2006, p. 304.
14. Fateh Muhammad Malik, Aatish-e-Rafta Ka Suragh, National Book Foundation, Islamabad, 2013, p. 321.
15. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, Classic, Lahore, 2001, p. 118.
16. Muhammad Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, 2006, p. 195.
17. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib Jadeed, murattaba Mufti Muhammad Anwar-ul-Haq, Madhya Pradesh Urdu Academy, Bhopal, 1982, p. 447.

18. Asadullah Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, Classic, Lahore, 2001, p. 190.
19. Ibid, p. 25.
20. Ibid, p. 26.
21. Muhammad Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal, Iqbal Academy, Lahore, 2006, p. 364.